بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

نظرات

مجمع البحوث الاسلامیہ قاہرہ کی مؤتمر ثانی منعقدہ المحرم ۱۳۸۵ھ - مئی ۱۹۶۵ء کی ایک ضخیم رپورٹ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ یہ "مجمع" جامعہ ازہر کے تحت قائم کیا گیا ہے اور اس میں دنیا کے مختلف حصوں سے مسلمان علماء اور مفکرین مدعو کئے جاتے ہیں۔ "مجمع" کی مؤتمر اوّل ۱۹۶۴ء میں منعقد ہوئی تھی۔ مؤتمر ثانی میں جیسا کہ اس رپورٹ میں درج ہے، ستائیس ممالک کے کوئی ساٹھ کے قریب ارکان وفد نے شرکت کی، جن میں پاکستان سے بھی چار علماء شامل تھے۔ مجمع البحوث الاسلامیہ کی مؤتمر ثانی میں جو بحثیں ہوئیں، زیر نظر رپورٹ میں انہیں جمع کیا گیا ہے تاکہ وہ اسلامی مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کے سامنے آجائیں۔

"مجمع" کے امین عام (سیکرٹری جنرل) نے پیش لفظ میں اس امر کی صراحت کی ہے کہ زیر بحث مسائل میں غور و فکر کے بعد مؤتمر جن نتائج پر پہنچی ہے، ان کی نوعیت اجماع کی نہیں کہ اس کے بعد بحث کرنے والوں کے سامنے دروازے بند کر دیئے جائیں۔ یہ دراصل ایک کوشش ہے دین اور زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی بدون دین میں کوئی کمی اور زندگی پر کسی زیادتی کرنے کے۔ پس بحث کا دائرہ وسیع ہے، ہر اس شخص کے لئے جس کو اللہ نے شرح صدر عطا کیا اور دین کی سمجھ اور تفقہ دیا ہے۔

فضیلۃ الدکتور محمود حب اللہ نے جو "مجمع" کے امین عام ہیں، اپنے پیش لفظ میں یہ بھی لکھا ہے کہ آج جو مشکلات ہمیں درپیش ہیں۔ اور جن پر مؤتمر میں بحثیں ہوئیں۔ ان میں سے مثال کے طور پر ایک تو انشورنس اور بیمہ (التامین) ہے اور دوسری مشکل معاملات زر کی ہے۔ یہ مشکل ہر مسلمان کو خواہ وہ کہیں بھی ہو، اور خواہ وہ جہاں بھی جائے پیش آتی ہے، اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کسی لین دین کے بارے میں اس کی حلت یا حرمت کے متعلق شرعی

حکم بیان کر دینا کافی نہیں، بلکہ آج ایک مسلمان کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ شرعی حکم کے ساتھ ایک متبادل نظام کا اضافہ ہو، جس کا اسلام سے اثبات ہوتا ہو اور اس سے متوقع فائدہ بھی حاصل ہو۔ چنانچہ یہ بات اس کی متقاضی ہے کہ فقیہ اور مفتی کے پہلو بہ پہلو مالیات واقتصادیات کے ماہر وغیرہ بھی ہوں، جو ان امور کا تجربہ اور سمجھ رکھتے ہوں۔ اس طرح ہی وہ مقصد پورا ہو سکے گا، جس کے لئے یہ اسلامی ادارہ بنایا گیا ہے۔

اور یہ اس لئے کہ امین عام موصوف کے الفاظ میں آج علمائے مسلمین کو جن مشکلات اور پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اس سے پہلے اس شکل میں علمائے مسلمین کو جو امّت اسلامیہ کے لئے اس عظیم علمی ورثے کو چھوڑ گئے ہیں، ان سے دوچار ہونا نہیں پڑا تھا۔

جناب حسین شافعی نائب رئیس الجمہوریہ نے صدر جمہوریہ جمال عبدالناصر کی طرف سے مؤتمر میں شریک ہونے والوں کا خیر مقدم کیا اور منجملہ اور باتوں کے انھوں نے خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلہ میں یہ الفاظ کہے :۔

"كما أخذت البلاد بأسباب تخطيط الأسرة لغرض مواجهة مشكلة تزايد السكان ودرأً لمخاطر الانفجار السكاني ومحاربة الفقر في منبعه ومهده"۔

(اسی طرح اس سرزمین نے خاندانی منصوبہ بندی کے اسباب و وسائل اختیار کئے ہیں تاکہ کثرت آبادی کی مشکل سے عہدہ برآ ہوا جاسکے۔ زیادہ آبادی کے پھٹ پڑنے کے خطرات کو روکا جاسکے اور فقر وغربت کا اس کے اصل منبع اور مرکز ابتدائی میں مقابلہ کیا جائے)

جناب حسین شافعی نے اپنی حکومت کی بعض اصلاحات کا ذکر کرتے ہوئے بچوں (الطفولة) اور ماؤں (الامومة) کی فلاح وبہبود کے سلسلے میں جو کچھ کیا گیا ہے، اس کے ضمن میں یہ کہا :۔

"وقامت الدولة باحترام حقوق المرأة في المجتمع ومساواتها بالرجل، في حدود الشريعة الغراء، واسقاط لبقايا الاغلال التي تعوق حركتها الحرة حتى تستطيع أن تشارك بعمق وايجابية في صنع الحياة وأن تكون في بيتها وفي مجتمعها قادرة على أن تسهم في بناء المجتمع على اساس من القوة والفضيلة۔"

(حکومت معاشرے میں عورت کے حقوق کے احترام اور مرد سے اس کے مساوات کو بروئے کار لائی اور یہ سب شریعت غرّاء کی حدود کے اندر رہتے ہوئے۔ وہ باقی ماندہ زنجیریں جو اس کی آزادانہ نقل وحرکت

کو روکتی تھیں، توڑ دی گئیں تاکہ وہ پورے انہماک اور ایجابی طور پر زندگی کی تشکیل و تعمیر میں شریک ہوسکے ۔ اور وہ اپنے گھر میں اور اپنے معاشرے میں قوت اور فضیلت کی اساس پر معاشرے کی تعمیر پر قادر ہو۔)

پھر اس کے بعد موصوف نے اپنی اشتراکیت کی تعریف کی اور کہا " فان اشتراکیتنا انعال لا اقوال "۔ اور یہ کہ اشتراکیت مادی ٹھوس وجود اور جدید قدریں رکھتی ہے، اور یہ ہیں :- عدل اجتماعی، کفالت اور زیادہ پیداوار، معنوی اور روحانی قوتوں میں اضافہ، امن کی دعوت، واضح اور معین مقاصد اور ملک کے ہر باشندے کے لئے صحت، علم اور روزگار کا حق۔

"مجمع البحوث الاسلامیہ" کی دوسری اور اس سے قبل پہلی مؤتمر میں پاکستان سے جو علمائے کرام تشریف لے گئے تھے، ان میں کئی ایک ایسے بزرگ ہیں، جنھوں نے اپنا وظیفہ حیات ہی یہ بنالیا ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی اور عائلی قانون کے سلسلے میں حکومت پاکستان کی طرف سے جو قوانین نافذ ہوئے ہیں، ان کی مخالفت کریں، ان حضرات کے رسالے، خطبے، وعظ اور درس صرف انہی امور کے لئے وقف ہیں۔ یہ ان قوانین پر صبح وشام برستے ہیں۔ انہیں قرآن وسنت کے خلاف بتاتے ہیں۔ ان کی مخالفت میں جو جی میں آتا ہے، کہنے سے دریغ نہیں کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان قوانین کو نافذ کرنے والی حکومت ان حضرات کی منافرت انگیزی کا نشانہ بنتی ہے۔ اس میں ہمارے یہ بزرگ اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ اور یہ سب کچھ اسلام کے نام سے ہوتا ہے اور بزعم خویش اعلائے کلمتہ اللہ کی خاطر ہوتا ہے۔

لیکن یہی بزرگ جو صدر ایوب کی حکومت کو مطعون کرتے اور اس کے خلاف اسلام کے نام سے عوام کو اشتعال دلاتے نہیں تھکتے، صرف اس بناء پر کہ اس نے خاندانی منصوبہ بندی اور عائلی قوانین کو نافذ کیا ہے، صدر ناصر کی حکومت کی دعوت پر قاہرہ تشریف لے جاتے ہیں، وہاں اسی مؤتمر میں شریک ہوتے ہیں، جہاں اس حکومت کا نائب صدر خاندانی منصوبہ بندی کے نفاذ کو اپنی حکومت کا ایک قابل تعریف کارنامہ بتاتا اور عورتوں کی آزادی کو نئے معاشرے کی تشکیل کے لئے ضروری قرار دیتا ہے۔ اور یہ صرف زبان سے نہیں، بلکہ صدر ناصر کی حکومت "تجدید پسندی" اور "تجدد پرستی" میں اتنی آگے ہے اور مصری معاشرہ ہمارے ان بزرگوں کے "شرعی پردے" کو اتنا پیچھے چھوڑ گیا ہے کہ پاکستان والوں کو اس تک پہنچنے میں معلوم نہیں کتنے سال لگیں۔ یعنی مصر میں اگر صدر ناصر کی حکومت خاندانی منصوبہ بندی اور عائلی قوانین نافذ کرتی ہے، تو وہ قابل گرفت نہیں، بلکہ وہ ممدوح ہی رہتی ہے۔ اور یہی اقدامات اگر صدر ایوب کی حکومت کرے، تو ان حضرات کو حق حاصل ہے کہ وہ اس کے خلاف

مخالفت ومنافرت کا طوفان کھڑا کر دیں۔ اور انہیں یہاں خدانخواستہ اسلام کا سفینہ ڈوبتا نظر آئے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

حضرات علماء میں سے بعض بزرگ وہ ہیں جن کی عمر کا ایک بڑا حصہ گویہ ثابت کرنے میں گزرا ہے کہ اسلام کے نزدیک ڈیموکریسی ناجائز ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت شرک کی ہے۔ لیکن اب وہ جمہوریت اور وہ بھی پارلیمانی جمہوریت کے قیام کو ہی اپنی اسلامی دعوت کا مقصود قرار دیتے ہیں۔ موصوف آج کل اپنے اس بنیادی تضاد کو یہ کہہ کر دُور کرنے میں کوشاں ہیں کہ "جمہوریت کا ایک مفہوم تو وہ ہے جو اسلام میں ہے اور ایک وہ ہے جو مغرب میں ہے۔۔۔ ۔۔۔ یعنی جمہوریت کے اسلامی تصوّر میں حاکمیت اللہ کی ہوتی ہے اور حکومت عوام کی مرضی سے بنتی ہے تاکہ وہ احکام الٰہی کے مطابق ملک کا نظام چلائے یعنی اسلامی جمہوریت میں حکومت جس طرح عوام کی مرضی کے خلاف ان پر نہیں ٹھونسی جا سکتی، اسی طرح وہ خدا کی مرضی کے خلاف نظام نہیں چلا سکتی"۔۔

موصوف فرماتے ہیں "یہاں خدا کے قانون میں جو حرام ہے، وہ حرام ہی رہے گا اور جو حلال ہے، وہ حلال رہے گا۔ حلال کو حرام کرنے کا حق کسی کو نہیں اور اللہ نے جسے حرام ٹھہرایا ہے، اسے حلال کرنے کا کوئی مجاز نہیں"۔ موصوف نے جمہوریت کی یہ تشریح اسی راولپنڈی شہر میں ۱۴ اپریل کو کی ہے۔

نظریاً "اللہ کی حاکمیت" اپنی جگہ مسلّم، لیکن عملی زندگی میں اس کی تطبیق کیسے ہوگی؟ پھر "احکام الٰہی" کا تعین کون کرے گا۔ نیز خدا کے قانون میں کون سی چیز حرام ہے اور کون سی حلال، اس کے بارے میں قطعی فیصلہ کرنے کا کون مجاز ہے۔ یہاں ہم ان چیزوں کا ذکر نہیں کرتے جن کی حرمت اور حلت بالکل ظاہر ہے۔ بلکہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں، جو مختلف فیہ ہیں۔ مثال کے طور پر انہیں بزرگ سے ۱۴ اپریل کی مجلس میں سوال کیا گیا کہ "اسلام میں انفرادی ملکیت کی حد کیا ہے"؟ اس کا جواب انھوں نے یہ دیا:- "اسلام نے انفرادی ملکیت پر کوئی حد عائد نہیں کی بلکہ اس کے حصول کے طریقوں پر پابندی لگائی ہے۔ اگر آدمی شریعت کے بتائے ہوئے راستے پر چلے تو جتنا چاہے، کما سکتا ہے۔ اس پر کوئی قدغن نہیں۔۔۔"

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انفرادی ملکیت کو محدود کرنا اللہ کے قانون میں حرام ہے اور اس کا لامحدود رہنا ہی اللہ کے قانون میں حلال ہے۔ اور اگر ایک جمہوریت انفرادی ملکیتوں کو محدود کرتی ہے تو کیا وہ اپنے اس فعل سے غیر اسلامی ہو جائے گی؟

غرض اس طرح کے سینکڑوں مسائل ہیں، جن کے بارے میں اختلافات ہو سکتے ہیں۔ اب اس کا فیصلہ کون

کرے کہ فلاں اقدام اللہ کے قانون میں حرام ہے اور فلاں حلال، مسیحیوں کے کیتھولک فرقے میں تو اس کا فیصلہ پوپ اور اس کے بشپ کرتے ہیں۔ کیا ہمارے یہ بزرگ اپنی "اسلامی جمہوریت" میں اس قسم کا کوئی کلیسائی نظام چاہتے ہیں؟

یہ بحث توضیح میں یوں ہی آگئی۔ ہم دراصل ان بزرگ اور ان کی جماعت سے صرف یہ پوچھنا چاہتے تھے کہ آپ حضرات پاکستان کی موجودہ حکومت سے اس لئے ناراض ہیں کہ وہ جمہوریت کے اصولوں پر عامل نہیں۔ آپ کا مطالبہ ہے کہ یہاں اس طرز کی جمہوریت نافذ ہو، جو آپ کے نزدیک صحیح جمہوریت ہے۔ بقول آپ کے "یہ عوام کا حق ہے۔ کہ وہ اپنے ملک کے معاملات میں بولیں۔ اپنی رائے کا اظہار کریں۔ اور اپنے ووٹ سے حکومت کو منتخب کریں"... آپ حضرات کو موجودہ حکومت سے یہ شکایت ہے اسی لئے آپ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور اس سے کسی قسم کا سروکار رکھنا گناہ سمجھتے ہیں۔

لیکن اِس ملک سے کچھ دُور سعودی عرب کی جو حکومت ہے، کیا وہ جمہوری ہے؟ اس میں شک نہیں کہ اس حکومت سے ہمارے ملک کے بہت اچھے تعلقات ہیں اور ہم بھی اس حکومت اور اس کے بیدار مغز اور روشن خیال فرمانروا کو پاکستان کا سچّا ہمدرد اور محب صادق مانتے ہیں۔ اس سے قطع نظر، یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے۔ کہ جس طرح کی جمہوریت کو آپ لوگ اسلامی جمہوریت مانتے ہیں، کیا آپ کو اس طرح کے آثار و قرائن وہاں ملتے ہیں۔

پاکستان کے نظام حکومت کو آپ کتنا بھی غیر جمہوری بتائیں، پھر بھی یہاں عدالتوں کی بالاتری موجود ہے۔ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے سامنے بجٹ پیش ہوتے ہیں، ایک آزاد اور بالاتر آڈیٹر جنرل کا محکمہ ہے اعلیٰ ملازمتوں کے لئے پبلک سروس کمیشن ہے، جس کی مرضی کے بغیر کسی اعلیٰ عہدے پر کوئی فائز نہیں ہو سکتا۔ انتخابات بھی ہوتے ہیں۔ انتخابات کے خلاف قانونی چارہ جوئی بھی کی جا سکتی ہے۔ پریس آپ کے خیال کے مطابق آزاد نہیں، لیکن اتنا پابند بھی نہیں کہ آپ لوگوں کی تقریریں نہ چھپیں۔ سیاسی پارٹیاں بھی ہیں۔ ان کے اجتماع ہوتے ہیں اور وہ حکومت کے خلاف قراردادیں پاس کرتی ہیں۔ اب جہاں تک ہماری معلومات بتاتی ہیں، سعودی عرب میں جمہوری نظام کے ان بنیادی لوازم میں سے کوئی چیز بھی نہیں۔ اور ظاہر ہے اس کے معقول اسباب ہیں، لیکن واقعہ تو یہی ہے کہ جس جمہوریت کے خام اور نامکمل ہونے کی وجہ سے آپ صدر ایوب کی حکومت کے خلاف جہاد میں مصروف ہیں اس کا ایک ادنیٰ شائبہ تک بھی ہمیں سعودی عرب کی حکومت میں نظر نہیں آتا لیکن اس کے باوجود آپ اس حکومت سے تعاون کرتے ہیں۔ اس کی دعوت پر آئے دن سعودی عرب جاتے ہیں۔ اس کی تعریف میں آپ اور آپ کے ساتھی

برابر رطب اللسان رہتے ہیں۔ غرض نہ صرف اِس ملک میں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی آپ اس حکومت کے حق میں پروپیگنڈا کرتے نہیں تھکتے۔

اب اگر آپ لوگ صدر ایوب کی حکومت سے واقعی اس کی عدم جمہوریّت سے ناراض تھے، تو منطقی اقتضا تو یہ تھا کہ آپ سعودی عرب کی حکومت کو اپنا آئیڈیل نہ بناتے اور نہ اس کی حمایت میں اس قدر سرگرم کار ہوتے۔ وہ حکومت ہزار اچھی ہو، لیکن وہ جمہوری ہرگز نہیں۔

دراصل صدر ایوب کی حکومت کی مخالفت کی وجہ نہ اسلام ہے اور نہ جمہوریت۔ آپ کے "اسلام" میں اتنی لوچ ہے کہ وہ ہر ضرورت کے وقت بدل سکتا ہے۔ باقی رہی جمہوریت، جو شخص حاکمیت عوام کا اصلاً مخالف ہو، اسے اپنے آپ کو جمہوریّت پسند کہنا کسی طرح بھی زیب نہیں دیتا۔

عجیب بات یہ ہے کہ وہ حضرات ضما، جن کا قبلہ مقصود قاہرہ ہے، خاندانی منصوبہ بندی اور عائلی قوانین کے اتنے ہی شدید مخالف ہیں، جتنے یہ حضرات جو سعودی عرب کو اپنا سب کچھ مانتے ہیں اور ان دونوں گروہوں کا یہ حال ہے کہ ایک دوسرے کے سخت دشمن ہیں۔ حالانکہ دونوں اسلام کے علمبردار بنتے ہیں۔ دونوں اسلامی نظام کے قیام کے مدعی ہیں۔ اور دونوں کا دعویٰ ہے کہ عوام ان کے ساتھ ہیں۔

یہ قصّہ جیسا کہ اوپر عرض ہوا ہے، نہ اسلام کا ہے نہ جمہوریت کا۔ یہ دونوں گروہ عوام مسلمانوں کے ایک بڑے حصے کی سادہ دلانہ قدامت پسندی اور روایتی مذہب سے جذباتی وابستگی سے فائدہ اٹھاتے ہیں، مذہب کے نام سے سیاست کاری میں آسانی یہ ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ "حاضرین" کم سے کم محنت سے میسّر آجاتے ہیں۔ اور چونکہ یہ حضرات خدا اور رسول کے ترجمان بن کر عوام کے سامنے آتے ہیں، اس لئے انہیں وہ کچھ کہنے کا حق مل جاتا ہے جو عام سیاست دان نہیں کہہ سکتے۔

اگرچہ یہ بات بڑی تلخ ہے، لیکن اسے کہے بغیر چارہ نہیں کہ جب تک قومی زندگی سے اس قسم کی مذہبی سیاست ختم نہیں کی جاتی۔ اس ملک میں صحت مند سیاست کا نشوونما پانا ناممکن ہے۔ اس مذہبی سیاست کی کم و بیش وہی حیثیت ہے جو ادب میں ایک خاص قسم کی صنف کی ہوتی ہے کہ گو اس پر لوگ لپکے پڑتے ہیں اور اس کی کتابیں دھڑا دھڑ بکتی ہیں لیکن اس کے باوجود حکومتوں کو ان پر قدغن لگانی ہی پڑتی ہے

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ بہت ضروری ہے۔ اس مذہبی سیاست کے کرتا دھرتا تھوڑے سے ہی لوگ ہیں

جنھیں بعض سازگار حالات نے ضرورت سے زیادہ اہمیت دے دی ہے۔ علمائے کرام کی ایک کثیر تعداد ایسی موجود ہے، جو اس قسم کی سیاست سے الگ تھلگ رہ کر دین کی خدمت کرتے ہیں اور جب ضرورت سمجھتے ہیں۔ حاکموں کو بھی ٹوکتے ہیں اور ان پر تنقید بھی کرتے ہیں، لیکن سیاست کاری سے وہ دُور ہیں۔

۱۰ سے ۱۵ اپریل تک پشاور میں علمائے کرام کا ایک اجتماع (سیمینار) ہوا۔ جس میں بعض ممتاز علماء کے علاوہ خاص طور سے تحصیل پشاور کے دیہات کے ائمہ اور خطباء شریک ہوئے، اس اجتماع کی دعوت خود علماء کی طرف سے دی گئی تھی۔ البتہ اس کا انتظام پشاور یونیورسٹی ٹاؤن میں واقع پاکستان اکیڈمی برائے ترقی دیہات کی شاندار عمارت میں کیا گیا۔ محکمہ اوقاف مغربی پاکستان کی مالی اعانت اور اکیڈمی مذکور کی کوششوں سے علماء کا اپنی نوعیت کا یہ پہلا اجتماع تھا جو پشاور میں منعقد ہوا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہر لحاظ سے بڑا کامیاب رہا۔

اس اجتماع میں مقالات پڑھے گئے، جن میں یہ بتایا گیا کہ ائمہ اور خطباء دیہات میں اپنی مفوضہ دینی خدمات کے ساتھ ساتھ خود اپنی اور عوام کی معاشی حالت کو بہتر بنانے اور ملک کو ٹھوس تعمیری راہوں پر آگے بڑھانے میں کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ علماء حضرات پشاور یونیورسٹی کے تعلیمی و سائنسی شعبوں اور بعض صنعتی اداروں میں بھی گئے۔ اور انھوں نے پاکستان کا نیا دارالسلطنت اسلام آباد بھی دیکھا۔

پاکستان کی صحیح اسلامی اصولوں اور جدید ترقی یافتہ طریقوں پر تعمیر صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ دوسروں کے ساتھ ساتھ علماء، ائمہ اور خطباء بھی اس میں برابر حصّہ لیں، امید ہے پشاور کا یہ اجتماعِ علماء اس راہ کی نشان دہی میں بڑا مفید ثابت ہوگا۔

آج کئی ایک اسلامی ملکوں میں قومی تعمیر و ترقی کے کاموں میں حضرات علماء، ائمہ و خطباءِ مساجد کو عملاً حصّہ لینے کے قابل بنانے کے لئے مناسب اقدامات کئے جا رہے ہیں اور اس سلسلے میں وہاں دینی درس گاہوں کے نصاب تعلیم میں کافی تبدیلیاں کی گئی ہیں، تاکہ ان سے فارغ التحصیل ہونے والوں کے لئے دینی خدمت کے ساتھ قومی زندگی میں شریک ہونے کے بھی وسیع مواقع ہوں۔ پاکستان کو جلد یا بدیر یہ کرنا ہوگا اور اگر وہ اسے جلد کرے تو اس کی قومی ترقی کی منزل اور قریب آسکے گی۔